دینی مدارس میں دنیوی تعلیم: عجوہ میں حنظل کی پیوندکاری

مفتی ابولبابہ شاہ منصور

"دینی مدارس کا نصاب ونظام" ایک ایسا موضوع ہے، جس پر بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے اور مزید اور مسلسل لکھا جاتا رہے گا۔ احقر اس کی عمومی نوعیت اور مجموعی ہیئت کے حوالے سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا، کہ یہ چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی، البتہ اس کے ایک جزوی پہلو اور ضمنی موضوع یعنی "درسِ نظامی میں دنیوی تعلیم کی ترویج یا پیوندکاری" پر اس سبب سے گفتگو کرنے کی جراءت کروں گا کہ اس سے طویل عرصے تک واسطہ رہا۔ "و لا ینبّئك مثل مجرّب"

موضوع کے دو حصے:...... اس عنوان کے دو حصے کیے جاسکتے ہیں: ایک درسِ نظامی میں انگریزی تعلیم (مروجہ سکولنگ سسٹم کے "ترقی یافتہ" مضامین) کی پیوندکاری اور دوسرے درسِ نظامی کے طلبہ کو انگریزی زبان کی تعلیم۔ یہ دونوں الگ الگ موضوع ہیں۔ ان دونوں کے متعلق اس عاجز کی رائے کا خلاصہ پہلے بیان کرتا ہوں پھر چند مشہور سوالات یا دلائل کا جواب اکابرین کے ملفوظات ومواعظ کے حوالے سے عرض کروں گا۔ کوشش ہوگی کہ کوئی حوالہ ایسا نہ ہو، جو پچھلے دو مضامین میں آچکا ہے۔

پہلا حصہ:...... پہلے موضوع (درس نظامی کے ساتھ اسکول کی تعلیم) کے متعلق راہِ اعتدال یہ معلوم ہوتی ہے کہ دینی مدارس میں دنیوی تعلیم کی پیوندکاری مخمل میں ٹاٹ کی پیوند لگانے، بلکہ عجوہ میں حنظل کی قلم کاری کے مترادف ہے۔ جن علوم کی دینی مدارس کے طلبہ یا فضلاء کو ضرورت ہے، انہیں درسِ نظامی کے نصاب میں مروج کتب کے طرز پر ڈھال کر، اسلوب ومثالوں کی اصلاح کر کے، گویا تطہیر وتدوین جدید کے عمل سے گذار کر، تخصصات میں اپنایا جاسکتا ہے۔ اس طرح کے عمل سے جغرافیہ وفلکیات، صحافت وریاضی اور اصولِ تدریس وتعلیمی نفسیات کو کامیابی کے ساتھ گذارا جاچکا ہے۔

دوسرا حصہ:...... دوسرے موضوع (درس نظامی کے دوران انگریزی زبان کی تعلیم) کے حوالے سے احقر اور اس کے ساتھیوں کے طویل تجربات کا خلاصہ یہ ہے کہ دینی مدارس میں انگریزی زبان کی "عمومی تعلیم" (از راہِ کرم عمومی کے لفظ پر نصب "واوین" پر ایک مرتبہ غور کرلیجیے) رہے سہے احوال و آداب کو "سیل العرم" کی طرح بہالے جائے گی۔ جیسا کہ اس نے ہندوستان کے طول وعرض کی مشرقی تہذیب کو فنا کر کے اس کی جگہ نیم مغربی نیم ملحدانہ تہذیب کو رواج دیا۔ چند ایک فضلاء کو بطورِ مترجم یا مُبلّغ یہ زبان سکھا دینا کافی ہے۔ عمومی سکہ رائج الوقت کے طور پر اسے نافذ کیا گیا تو نئی نسل کی پہچان مشکل ہو جائے گی کہ وہ فاسد ہے یا کاسد؟ داعی ہے یا داغی؟ راقم الحروف کے سامنے متعدد ایسے طلبہ اور فضلائے کرام کا انجام آچکا ہے جس کے بعد تو انگریزی زبان کو "بخشو بی بلی! ہم تو لنڈورے ہی بھلے" کہے بغیر چارہ نہیں۔ اس لیے انگریزی زبان کے نصاب اور اپنے اساتذہ کی تیاری میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد بھی ہم نے اسے محدود سے محدود تر کر دیا ہے۔

دنیوی تعلیم کے حق میں دیے گئے چند دلائل کا تجزیہ:...... بعض حضرات طلبۂ علوم دینیہ کے لیے دنیوی تعلیم کو مفید و مناسب خیال کرتے ہیں اور بعض لازم و ناگزیر۔ ان حضرات کے چند دلائل ہیں، جن پر تبصرہ و تجزیہ ہم اکابر کی تحریرات میں ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔

پہلی دلیل۔ اکابرین کی تائید:...... پہلی دلیل یہ ہوتی ہے کہ خود ہمارے اکابرین گرامی، سرسید کے تعاون سے ایسا کرنا چاہتے تھے۔ حالات یا وسائل نے انہیں موقع یا مہلت نہ دی۔ اب ہمیں "سعادت مند پسر" ہونے کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ کچھ کرنا چاہیے جو "پدرِ مکرّم" نہ کر سکے۔ اس موضوع پر پیش کیے گئے دوسرے حوالوں کے علاوہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سرسید اور مولانا مملوک علی صاحب آپس میں استاد بھائی تھے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ آخر عمر میں علی گڑھ تشریف لے گئے تھے۔ انہوں نے دہلی میں "ادارۃ المعارف" اور "جامعہ ملّیہ" کی بنیاد رکھی یا رکھوائی تھی۔ علی گڑھ کے مقابلے (سبحان اللہ! مقابلے کے لفظ نے بحث کو کتنا آسان کر دیا) کے لیے "مسلم نیشنل یونیورسٹی" کی تجویز منظور کی۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے بنگال کے مدارس (اغلبًا اسکولوں) کے لیے دونوں طرح کے علوم پر مشتمل سولہ سالہ نصاب بنایا۔ کلکتہ میں مولانا ابو الکلام آزاد نے مدرسہ اسلامیہ عالیہ کے نام سے ادارہ قائم کیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کا جواب ہم خود نہیں دیں گے، اس لیے کہ ہمیں یہ سمجھ نہیں آتا کہ شیخ الہند رحمہ اللہ کو دہلی اور حضرت مدنی قدس سرہ کو بنگال جانے کی کیا ضرورت تھی؟ حضرت شیخ الہند اٹھائیس سال تک دار العلوم دیوبند کے صدر مدرس رہے۔ حضرت مدنی تیس سال تک دار العلوم کے صدر مدرس رہے۔ ان حضرات نے اس تعلیم کو اپنے ادارے میں تو جاری نہ کیا، دہلی اور بنگال پر توجہ کیوں مرکوز فرمائی؟ کیا اس لیے کہ وہ دینی مدارس میں دنیوی تعلیم کے قائل نہ تھے، بلکہ دنیوی اداروں میں دینی تعلیم جاری کرنا چاہتے تھے؟ بہرحال اس اشکال کی بنیاد پر ہم خود سے اس کا جواب نہیں دے سکتے، البتہ اس کا جواب ہمیں حضرت حکیم الامت

قدّس سرّہ کے ذیل کے ملفوظ سے بوضاحت وصراحت سمجھ آسکتا ہے:

”جس وقت سرسید نے علی گڑھ کالج کی بنیاد ڈالی تو انہوں نے اپنے ایک معتمد خاص کو گنگوہ بھیجا، اس لیے کہ حضرت گنگوہیؒ سے ملاقات کرکے مولانا [اس سے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ مراد ہیں] کو یہ پیغام پہنچائے کہ میں نے مسلمانوں کی فلاح اور بہبود وترقی کے لیے ایک کالج کی بنیاد ڈالی ہے، کیونکہ دوسری قومیں ترقی کرکے بہت آگے پہنچ چکی ہیں، مگر مسلمان پستی کی طرف جارہے ہیں۔ اگر آپ حضرات نے اس میں میرا ہاتھ بٹایا تو میں بہت جلد اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاؤں گا، جو حقیقت میں مسلمانوں کی کامیابی ہے۔ غرض یہ کہ وہ سفیر گنگوہ آئے اور حضرت مولانا کے پاس حاضر ہوکر سلام مسنون کے بعد سرسید کا پیغام عرض کیا۔ حضرت مولانا نے سرسید کا پیغام سن کر فرمایا: ”بھائی! ہم تو آج تک مسلمانوں کی فلاح وبہبود اور ترقی کا زینہ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی اتباع ہی میں سمجھتے تھے مگر آج معلوم ہوا کہ ان کی فلاح وبہبود اور ترقی کا زینہ اور بھی کوئی ہے، تو اس کے متعلق یہ ہے کہ میری ساری عمر قال اللہ تعالی وقال الرسول ﷺ میں گزری ہے، اس لیے مجھے ان چیزوں سے زیادہ مناسبت نہیں اور حضرت مولانا قاسم رحمة اللّٰه علیه کا نام لیا کہ وہ ان باتوں میں مبصر ہیں، ان سے ملو۔ وہ جو فرمائیں گے، اس میں ہم ان کی تقلید کریں گے، کیونکہ ہم تو مقلد ہیں۔“ یہ صاحب حضرت مولانا قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ملے اور سرسید کا پیغام دیا اور اس پر حضرت گنگوہی رحمة اللّٰه علیه سے جو گفتگو ہوئی تھی اور اس پر حضرت مولانا نے جو جواب دیا تھا، سب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمة اللّٰه علیه کو سنادیا۔ حضرت مولانا نے سنتے ہی فی البدیہہ فرمایا:

”بات یہ ہے کہ کام کرنے والے تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ کہ نیت ان کی اچھی ہوتی ہے، مگر عقل نہیں۔ دوسرے وہ کہ عقل تو ہے، مگر نیت اچھی نہیں۔ تیسرے یہ کہ نہ نیت اچھی، نہ عقل۔ سرسید کے متعلق ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ نیت اچھی نہیں، مگر یہ ضرور کہیں گے عقل نہیں، اس لیے کہ جس زینہ سے مسلمانوں کو وہ معراج ترقی پر لے جانا چاہتے ہیں اور ان کی فلاح وبہبود کا سبب سمجھتے ہیں، یہ ہی مسلمانوں کی پستی کا سبب اور تنزلی کا باعث ہوگا۔“

اس پر ان صاحب نے عرض کیا: ”جس چیز کی کمی کی شکایت حضرت نے سرسید کے اندر فرمائی ہے، اسی کو پورا کرنے کے لیے تو آپ حضرات کو شرکت کی دعوت دی جارہی ہے، تاکہ تکمیل ہوکر مقصود انجام کو پہنچ جائے۔“

یہ ایسی بات تھی کہ سوائے عارف کے دوسرا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ حضرت مولانا نے فی البدیہہ جواب فرمایا:

”سنت اللہ یہ ہے کہ جس چیز کی بنا ڈالی جاتی ہے، بانی کے خیالات کے آثار اس بناء میں ضرور ظاہر ہوں گے اور اس کی وہاں بالکل ایسی مثال ہے کہ ایک تلخ درخت کی پود قائم کرکے ایک مٹکے میں شربت بھر کر اور ایک ولی کو وہاں بٹھلا کر ان سے عرض کیا جائے کہ اس شربت کو اس درخت کی جڑ میں سینچا کرو۔ سو جس وقت وہ درخت

پھول پھل لائے گا، سب تلخ ہوں گے۔"

واقعی ہی عجیب بات فرمائی۔ میں نے اس تحریک کے زمانے میں ایک موقع پر کہا تھا کہ جس کو تم اب پچاس برس کے بعد سمجھے ہو کہ علی گڑھ کالج کی وجہ سے انگریزیت اور دہریت اور نیچریت پھیلی ہے اور لوگوں کے دین اور ایمان برباد ہوئے۔ اس کو ایک مبصر پچاس برس پہلے کہہ چکے تھے۔" (حکیم الامت کے حیرت انگیز واقعات: ص ۴۹۱)

دوسری دلیل۔ بمع جواب الدلیل:...... پہلی دلیل تو نقلی تھی۔ ایک بہت مضبوط عقلی دلیل خصوصی طور پر وہ حضرات علمائے کرام دیتے ہیں، جو خود مسجد و مدرسہ کے وسیلہ سے دنیا و آخرت کی نعمتوں سے فیض یاب ہو رہے ہیں، لیکن اس عزت و افتخار سے اپنے صاحبزادگان کو بھی بہرہ ور کرنے کے لیے مدرسہ کی تعلیم کو کافی نہیں سمجھتے اور انہیں پورے خشوع و خضوع سے اسکول کی تعلیم دلا رہے ہیں۔ اتفاق ہے کہ ان حضرات کی دلیل اور جواب الدلیل دونوں ہمیں اکابر کے کلام سے مل جاتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

"حضرت تھانوی قدس سرہ کے ایک عزیز ہیں، جو واعظ ہیں۔ انہوں نے اپنے لڑکوں کو انگریزی پڑھائی ہے۔ حضرت ان سے بہت ناراض ہیں۔ حضرت نے ان کو منع کر دیا ہے کہ میرے پاس خط نہ بھیجا کرو۔ فرمایا کہ انہوں نے اس بات کو گوارا کر لیا، انگریزی پڑھانا نہ چھوڑوایا۔ فرمایا کہ میں نے کہا: "شرم نہیں آتی۔ وعظ کہتے ہو اور انگریزی اپنے بچوں کو پڑھاتے ہو؟ اگر مولوی نہ ہوتے تو اتنا ناگوار نہ ہوتا۔ اب کیا منہ رہا منبر پر بیٹھ کر دین کی ترغیب دینے کا؟" انہوں نے یہ عذر پیش کیا کہ لڑکے کم عقل ہیں، اس لیے علم دین پڑھانے کے قابل نہ تھے۔ میں نے کہا: "سبحان اللّٰہ! اس صورت میں تو ان کو علم دین پڑھانا اور بھی ضروری تھا، کیونکہ اگر کم عقل نہ ہوتے تو ان کے بگڑنے کا اندیشہ نہ تھا۔ عقل ان کو برائیوں سے روکے رہتی۔ اب جب کہ عقل بھی نہیں اور علم دین بھی نہ ہوگا، تو کیا چیز ان کے پاس رہی، جو شر اور فتنوں سے محفوظ رکھ سکے؟ یہی دو چیزیں ہیں، جن کے ذریعہ سے آدمی برائیوں سے بچ سکتا ہے۔" اس کا ان سے کچھ جواب نہ بن سکا۔

فائدہ: اس سے حضرت والا کا کمال فہم و تجربہ و فراست اور اصلی محبت عزیزوں کے ساتھ صاف ظاہر ہے۔

(کمالاتِ اشرفیہ: ص ۴۸۹)

تیسری دلیل۔ استعداد میں بہتری:...... عقلی نکات اور زمانے کے گرم سرد تجربات پر استوار ایک اور زوردار اور "ہمدرد و ہمدم و ہمنوا" قسم کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ علوم دنیویہ سے طلبۂ دین کی استعداد بہت بہتر ہو جائے گی۔ ذہن کھل جائے گا۔ دنیا اور اہلِ دنیا سے واقفیت پیدا ہو جائے گی اور وہ دین کا کام بہتر انداز سے کر سکیں گے۔ یہ دلیل ہمارے اسلاف کے سامنے کافی شد و مد سے پیش کی گئی تھی۔ آیئے! غور کرتے ہیں انہوں نے اس کا کیا جواب دیا؟

پہلے تو استاد الکل حضرت مولانا یعقوب صاحب رحمة اللّٰه عليه کا ملفوظ ملاحظہ فرمایئے جو "مجالس مفتی اعظم"

ص ۳۳۱ پر موجود ہے:

''ایک مرتبہ (ندوہ میں جہاں دین اور دنیا کی تعلیم کی پہلی بنیاد ڈالی گئی، یہ نظریہ بھی بُرا نہ تھا) حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب ؒ سے کسی نے عرض کیا تھا کہ دین کی تعلیم کے ساتھ دنیا کی تعلیم بھی جاری کرا دیجیے، تو فرمایا: ''ناپاکی کے ساتھ کبھی پاکی جمع نہیں ہوتی۔ دین کے ساتھ دنیا کو اگر جوڑا جائے تو تجربہ یہ ہے کہ صرف دنیا ہی رہ جاتی ہے۔ ہاں! دین کی تعلیم الگ ہو پھر دنیا کی بعد میں ہو جائے، معاش کے لیے، تو جائز ہے۔'' چنانچہ ندوہ میں تعلیم کی بنیاد ڈالی گئی تو حضرت گنگوہی ؒ کے پاس لوگ آئے۔ حضرت ؒ نے فرمایا: ''اصول و مقاصد تو ٹھیک ہیں، لیکن دل کو نہیں لگتا کہ دین بھی پورا ہو جائے اور دنیا کی نہج بھی آ جائے۔ یہ دل کو نہیں لگتا۔ لہٰذا میں اس میں نہیں آ سکتا۔ آپ لوگ کریں۔ میں اس کی مخالفت نہیں کرتا''، لیکن پھر لوگوں نے دیکھا کہ انگریزی تعلیم غالب آئی اور دین صرف ایک علم بن کر رہ گیا اور عمل سے کوئی واسطہ نہ رہا۔''

حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ بنام ''احسن التفہیم لمسئلۃ التعلیم'' لکھا ہے۔ اس میں وہ اس موضوع پر اپنی رائے دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''مدارس کی تیسری قسم وہ ہے جو دینی اور دنیوی، عربی اور انگریزی تعلیم سے مرکب ہے۔ ان مدارس سے نہ کوئی دین کا عالم مستند اور معتبر نکلا اور نہ کوئی انگریزی علوم و فنون کا قابل اور ماہر نکلا۔ ان مدارس کے سند یافتوں کی انگریزی قابلیت کا اندازہ تو انگریزی کے قابل اور ماہر لگائیں گے اور عربی قابلیت کا یہ عالم ہے کہ ان مدارس سے جو حضرات مولوی فاضل کی سند لے کر آتے ہیں تو امتحان کے میدان میں یہ سند یافتہ فاضل ''فضول'' سے مشتق ثابت ہیں اور علامہ ''الامہ'' ہوتے ہیں۔ ''عِلم'' کی بجائے ''اَلَم'' سے مشتق ہوتے ہیں۔ اور اکثر و بیشتر کا یہ حال ہے کہ عربی کی عبارت بلکہ بسا اوقات اپنی سند بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے۔ اب آپ انصاف فرمائیے کہ یہ حضرات مسلمانوں کے بچوں کو علوم دینیہ کی کیسے تعلیم دے سکتے ہیں۔ اسی قسم کا ایک مدرسہ جامعہ ملیہ ہے جو ڈاکٹر ذاکر حسین کی تجویز سے دہلی میں قائم ہوا اس کا حال بھی سب کے سامنے ہے۔ نہ دین اور نہ دنیا ہے اور آج اس کا بانی بھارت حکومت کا نائب صدر ہے اور واردھا اسکیم کا مصنف ہے۔ اس سے دین کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ غرض یہ کہ اس نصف صدی میں جس قدر مدارس بھی اس نظریۂ امتزاج کے ماتحت قائم ہوئے، تجربہ سے وہ سب بے کار ثابت ہوئے۔ ان سے فارغ التحصیل نہ عالم دین بن سکا، نہ انگریزی کا گریجویٹ ہو سکا۔''

(احسن التفہیم ص ۲۳، ۲۴ شائع کردہ: الخادم، لاہور)

چوتھی دلیل۔ معاشی مسائل کا حل: ......ایک مشہور اور مسحور کن دلیل ''عالمِ دین کے جدید معاشی مسائل کے حل'' کے حوالے سے دی جاتی ہے کہ دنیوی تعلیم سے رزق کے سوتے پھوٹ پڑتے ہیں اور انسان نعمت ہائے الٰہیہ سے نہال

ہو کر دین کے کام میں بے فکری سے جُت سکتا ہے۔ یہ دلیل مختلف انداز میں مختلف عنوانات سے سامنے آتی رہتی ہے اور بڑی وزن دار محسوس ہوتی ہے۔ آیئے! دیکھتے ہیں ہمارے اکابر نے اسے عقل و تجربے کے ترازو میں تولا تو کیا وزن نکلا؟

☆...... ”حضرت مدنیؒ انگریز کی طرح انگریزی اور انگریز کی نوکری کو بھی پسند نہ کرتے تھے۔ تحصیل علم سے فراغت پر طلبہ کو فرماتے: ”بھوکے مر جانا، انگریز کی نوکری نہ کرنا۔“

چنانچہ جو لوگ مولوی فاضل، منشی فاضل کی نوکری لے کر ملازمت کرنا چاہتے، عام طلبہ انہیں ”مولوی پاگل“ کہتے کہ بے یقین کے مولوی پاگل ہی ہوتا ہے۔ (الخیر، رجب ۱۴۳۳ھ: ص ۲۲)

☆...... حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ملفوظ کمالات اشرفیہ، ۲۲۴ میں منقول ہے:

”فرمایا کہ جب مدرسہ کی ابتدا ہوئی تو بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اس میں انگریزی بھی ہونی چاہیے۔ میں نے مصالح مدرسہ کے خلاف ہونے کے سبب منع کیا تو بعض لوگوں نے اس پر کہا کہ جب معاش اس پر موقوف ہے تو کیا کریں؟ یہاں شیعی تھے قصبہ کے بخشی۔ وہ بولے: ”کیوں صاحبو! اگر کوئی قانون ایسا ہو جاوے کہ نوکری جب ملے گی کہ نصرانی ہو تو کیا آپ کو یہ بھی گوارا ہوگا؟“ تو سب لوگ سن کر چپ ہو گئے۔

آگے فائدے کے تحت لکھا ہے:

”کسی دینی مدرسے میں انگریزی داخل کر کے دین و دنیا کا ملغوبہ بنانا تجربہ سے سخت مضر ثابت ہوا ہے۔ اس سے حضرت والا کا تجربہ، فراست، انجام بینی، دور اندیشی اظہر من الشمس ہے۔“ (کمالاتِ اشرفیہ: ۲۲۴)

☆...... حضرت مولانا خیر محمد جالندھری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک سرکاری وفد آیا کہ آپ یہ درخواست دے دیں کہ آپ کے مدرسہ کے فارغ کو مولوی فاضل کا درجہ دے دیا جائے۔ جب یہ درخواست منظور ہو جائے گی تو ملازمت بھی مل جائے گی۔ فرمایا: ”اب کوئی دین سمجھ کر پڑھنے آجاتا ہے پھر تو یہ بھی نہ ہوگا۔“ ایک دوسرا وفد آپ کے پاس آیا کہ جو آپ کے پاس تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان کی معاش کی کیا فکر کرتے ہو؟ فرمایا: ”ہم دین، فکرِ معاد کے لیے پڑھاتے ہیں۔ معاش خود حل کریں یا حکومت جو دعوے دار ہے، وہ حل کرے۔“ (ماہنامہ الخیر، رجب ۱۴۳۳ھ)

☆...... خیر المدارس کے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد صدیق صاحب دامت برکاتہم کے پاس ایک مرتبہ سرکاری وفد آیا اور حسبِ عادت چند چلے ہوئے سوال کیے۔ ملاحظہ فرمائیے کیا ٹکے ٹکائے اور لگے بندھے جواب دیے گئے۔

سوال: کیا آپ دینی مدرسہ میں علوم عصریہ داخل کرنے کے حق میں ہیں؟

جواب: بندہ نے جواب دیا: ”ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، ہرگز نہیں!“

سوال: اس پر انہوں نے سوال کیا کہ آپ کیوں حق میں نہیں؟

جواب: بندہ نے جواب دیا: ”ہمارے مدارس میں جو حفاظت دین کی تحریک ہے، دنیوی تعلیم سے وہ متاثر ہوتی

ہے۔"

سوال: اس پر انہوں نے سوال کیا: "وہ کیسے؟ وہ کیسے؟"

جواب: "ہم نے قرآن کا سو فیصد حافظ دینا ہے۔ قرآن کو محفوظ رکھنے کے لیے اور ایسے ہی حدیث وفقہ اسلامی کو محفوظ رکھنا ہے۔ اب اگر علوم عصریہ داخل کر دیے جائیں تو یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک من بوجھ اٹھانے والے پر دو من بوجھ ڈال دیا جائے تو اس سے برداشت نہ ہوگا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مدارس کے نصاب میں کمی کر دی جائے تو حفاظتِ دین کی تحریک متاثر ہوتی ہے۔ یہ تاریخ یا جغرافیہ نہیں کہ ۲۵ فیصد نمبر لے کر ڈگری دے دی جائے۔ یہاں تو سو فیصدی حافظ بنانا ہوتا ہے۔"

سوال: اس پر انہوں نے سوال کیا: پھر ان کے معاش کا کیا کریں گے؟

جواب: "قلم در کف دشمن است۔" قلم دشمن کے ہاتھ میں ہے۔ یعنی انگریزی خواں کے ہاتھ میں اقتدار ہے، جو ہمارے مدارس کے تعلیم یافتہ کو ناخواندہ قرار دیتا ہے۔ ہمارے مدارس کا فارغ، تاریخ پڑھا سکتا ہے، جغرافیہ پڑھا سکتا ہے، اردو پڑھا سکتا ہے، فارسی پڑھا سکتا ہے۔ کیا مدارس کا فارغ التحصیل پہلی کا قاعدہ الف آم اور بے بلی بھی نہیں پڑھا سکتا؟ ان کو خواندہ قرار دو۔ ان کے معاش کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

پھر حضرت نے سوال کیا: "ہماری طرف ہزار میں سے ایک آتا ہے اور تمہاری طرف نو سو ننانوے ہیں۔ تمہیں ایک فی ہزار کی روٹی کی فکر ہے اور نو سو ننانوے کے دین کی کوئی فکر نہیں؟ تم ان کے دین کی فکر کرو تو دینی علوم کو سکول کالج میں داخل کرو۔ اُن کا دین بن جائے اور اِن کا معاش حل ہو جائے گا۔"

(ماہنامہ الخیر: رجب ۱۴۳۳ھ)

☆......☆......☆

آگے بڑھنے سے پہلے:...... یہاں پہنچ کر آگے بڑھنے اور دوسرا موضوع شروع کرنے سے پہلے ہم نکتۂ زیر غور کو ایک بار پھر واضح کر لیں تو بات سمجھنے سمجھانے میں آسانی رہے گی، نیز وہ فرق بھی واضح ہو جائے گا جو ہمارے اکابر کی محنتوں اور ہماری جدوجہد کے رخ میں آتا جا رہا ہے۔ ہمارے ہاں علمائے کرام کو کارآمد صلاحیتوں سے آراستہ کرنے اور جدید تعلیم یافتہ طبقے سے دوریاں ختم کرنے کا یہ طریقہ بتلایا جاتا ہے کہ دینی مدارس کو مشرف بہ علوم جدیدہ کر دیا جائے۔ حضرات اکابر اس کا حل اس کے برعکس بتلاتے تھے، جو ہماری کم ہمتی کے سبب ہم سے ہو نہیں پاتا، تو پھر ہم اس پسپائی کو مجبوری کا نام دے لیتے ہیں۔ ان حضرات کا زور اس پر تھا کہ دنیوی اداروں کو دینی علوم سے بہرہ ور کیا جائے۔ گویا وہ "دنیوی و دینی علوم کا امتزاج" نہیں، بلکہ "دینی و دنیوی علوم کے امتزاج" کے قائل تھے، یا پھر اتنا فرماتے تھے کہ بعض علماء کو فراغت کے بعد ایک آدھ فن یا زبان پڑھوالی جائے۔ طلبہ کے لیے درسِ نظامی میں دنیوی تعلیم کی پیوند کاری، یا

فراغت کے بعد سب فضلاء کے لیے یونیورسٹیوں کی تعلیم کے ہرگز قائل نہ تھے۔ ملاحظہ فرمایئے چند اقتباسات۔ ان میں دوسرا موضوع یعنی مکمل انگریزی تعلیم نہیں، بلکہ فقط انگریزی زبان کو گوارا کر لینے کے حوالے سے بھی اکابرین کا موقف سامنے آجائے گا۔

(۱)...... دارالعلوم دیوبند میں انگریزی تعلیم داخل کرنے کا مشورہ ہوا، مہتمم مدرسہ کی رائے ہوئی کہ انگریزی داخل کر لی جائے۔ آخر فیصلہ ہوا کہ حضرت گنگوہیؒ سے دریافت کر لیا جائے۔ جب حضرت گنگوہیؒ سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: ”ہم نے تو ٹھیٹھ ملاّ بنانے ہیں۔“

(۲) حضرت تھانویؒ کے پاس وفد آیا کہ طلبہ کو انگریزی پڑھائی جائے، تو انہوں نے فرمایا:

> ”تین صورتیں ہیں: (۱) انگریزی خوانوں کو دینی تعلیم دی جائے تو وہ اتنے دور جا چکے ہوتے ہیں کہ وہ دین پڑھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔ (۲) دینی تعلیم کے ساتھ انگریزی کو بھی شامل کر لیا جائے تو نتیجہ اخس، ارذل کے تابع ہوتا ہے، اس لیے طلبہ دیندار نہ رہیں گے۔ (۳) علماء کو انگریزی پڑھائی جائے، اس کے لیے مستقل ادارے کھولے جائیں، جہاں علماء علومِ عصریہ پڑھیں۔“

اس کے بعد فرمایا: ”مشورہ دینے والے آج آتے ہیں!؟“ (یعنی پھر کبھی نہیں آئے) (کمالاتِ اشرفیہ: ص ۲۲۴)

حضرت تھانوی قدس سرّہ کا اس موضوع پر ایک مکمل رسالہ بھی ہے۔ ”تحقیق تعلیم انگریزی“ کے نام سے معنون اس رسالے کو حال ہی میں (الخادم، لاہور) نے شائع کیا ہے۔ اس کے ص ۷ پر فرماتے ہیں:

> ”جب یہ مقدمات عشرہ مُمہّد (تمہید کے طور پر) ہو چکے، اب بعونہ تعالیٰ مقصود کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔
>
> جاننا چاہیے کہ انگریزی اپنی ذات میں ایک زبان ہے اور باعتبار کورس متعارف کے چند فنون وعلوم کا نام ہے۔
>
> کسی زبان یا کسی فن علمی کا سیکھنا اپنی ذات میں ممنوع نہیں کہا جاتا لیکن مفاسد اور قبائح مل جانے سے ممنوع لغیرہ ہو سکتا ہے اور جب مفاسد اور قبائح مرتب ہونے لگیں باوجود اپنی اباحت اصلیہ کے قابل ممانعت ہو جاوے گا۔ اب ان آثار کو ملاحظہ فرمایئے جو اس وقت انگریزی تعلیم میں پیدا ہوتے ہیں۔ نماز و روزہ میں کاہلی بلکہ اعراض عقائد دینیہ میں ضعف بلکہ تشویش وانکار، تکبر، نمائش، تصنّع وتقلید کفار، دوسروں کو حقیر سمجھنا، دینداروں کو نظر ذلت سے دیکھنا اور یہ سب دین کی بربادی ہے، کیونکہ امور مذکورہ اجزائے دین ہیں اور شب و روز دماغ میں ترقی مال اور حصول مناصب کی ہوسیں پکنا ان کی تحصیل میں احکام شرعیہ کی ذرہ برابر بھی نظر میں وقعت نہ رہنا اور اس مقدمہ میں بے باکی آجانا اور یہی دنیا ہے جو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک مبغوض و ملعون ہے۔ گو اس وقت اس دنیائے ملعونہ کا نام ہوس ناکوں نے اولوالعزمی اور ترقی رکھا ہے مگر عنوان بدلنے سے معنون نہ بدلے گا نہ اس کا حکم بدلے گا اور اگرچہ بعض لوگوں میں یہ آثار نہیں پیدا ہوتے یا کم پیدا ہوتے مگر

شاید فیصدی مشکل سے دس آدمی اس سے محفوظ ہوں تو ہوں پس اس تخلف کو قابل اعتبار نہیں سمجھا جاوے گا۔

البتہ جو شخص دنیا کی ضرورت سے پڑھنا چاہے (بشرطیکہ وہ ضرورت شرعاً بھی ضرورت سمجھی جاوے اور اعلی درجہ کے پاس اور ڈگریوں کا حاصل کرنا اور اس سے اعلی درجہ کے عہدوں کا حاصل کرنا جس میں سرتاسر شریعت کی مخالفتیں کرنا پڑتی ہیں، حد ضرورت سے خارج ہے) یا کسی دینی ضرورت سے پڑے، مثلاً مخالفین کے اعتراضات کے جواب دینے کے لیے یا مخالفوں کو اسلام کی دعوت کرنے کے لیے (اور یہ تو عنقاء ہے) تو بقدر رفع ضرورت اجازت ہوگی اور اس سے آگے بندش۔ اس تقریر سے صاحب انصاف کے نزدیک انگریزی تعلیم کے قبح میں ذرا بھی شک نہ رہا ہوگا۔"

خلاصۂ کلام:......الغرض ہمارے اکابرین کا موقف دو نکات پر مبنی تھا:

(۱)......بعض دینی جامعات میں منتخب فضلائے کرام کے لیے تخصص کے درجات قائم کیے جائیں، جہاں پر فضلائے کرام کو جس فن سے مناسبت ہو، ان کا ماہر بنا کر میدانِ عمل میں بھیجا جائے۔ تحکیم و قضاء، اقتصادیات و معاشیات، نیز تقابلِ ادیان اور مکالمات و مباحثات کے فن سے آگاہ کیا جائے۔

(۲)......دینی مدارس کو علوم دنیویہ سے خلط کر کے متاثر نہ کیا جائے، بلکہ علومِ دنیویہ والوں کو دین میں داخل کر کے انہیں دیندار بنانے کی کوشش کی جائے۔

اس طرح کی کوششوں کی تائید اکابر کے کلام اور تعامل سے تو ملتی ہے لیکن...درس نظامی کے ساتھ ساتھ دنیوی تعلیم یا اس کے بعد تمام فضلاء کے لیے بغیر کسی انتخاب و تخصیص کے انگریزی زبان کی تعلیم کی کوئی معتبر شخصیت قائل نہ تھی، بلکہ اسے ضرر رساں اور مقصد میں مخل سمجھا جاتا تھا۔ اگر اکابر کی کسی تحریر میں اس طرح کا کوئی ذو معنی حوالہ ملتا بھی ہے تو اسے مندرجہ بالا اول الذکر دو میں سے ایک مطلب پر محمول کرنا چاہیے نہ کہ مؤخر الذکر دو امور پر۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس امانت کی حفاظت کی کماحقہ توفیق دے جو متبرک ورثے کے طور پر ہم تک پہنچی ہے اور جسے بکمالِ دیانت اصلی حالت میں آگے پہنچانا ہم پر فرض ہے۔

☆......☆......☆